معانی الآثار ومشکل الآثار للامام الطحاوی

(از مولوی سید عبد الرزاق صاحب قادری جعفر ایم اے (عثمانیہ))

(۳)

باقی سلیمان اعرابی تو ایک گمنام شخص ہے۔ حافظ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی زہری کے تلامذہ میں اس کا نام لیا گیا ہے جو شدتِ جہالت وشدتِ ضعف کی کافی دلیل ہے، مگر طحاوی کی دقتِ نظر نے جرح وتعدیل کے اس عام ہتھکنڈے کو کافی نہیں خیال کیا۔ اسی لئے روایتی تنقید کے ساتھ درایت کے ایک قاعدہ سے بھی اس روایت کو وہ جانچنا چاہتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ ایک طرف تو زہری کا ایسا شاگرد یعنی سلیمان اس روایت کو زہری کی طرف منسوب کرتا ہے یعنی عمرو بن حزم کی کتاب الصدقات جیسی مفصل کتاب جس کے متعلق میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ فلسکیپ کے ایک صفحہ سے زائد میں وہ روایت بڑے ٹائپ میں آتی ہے۔ بیہقی میں یہ روایت موجود ہے جس سے اس کی طوالت اور گرانمائگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ طحاوی کا سوال یہ ہے کہ ہمیں عقلاً بھی تو سوچنا چاہیے کہ زہری کے پاس جب ایسی عمدہ مفصل قیمتی کتاب صحیح سند سے موجود تھی تو یہ کیا بات ہے کہ وہ اپنے دوسرے جلیل القدر تلامذہ مثلاً یونس بن یزید وغیرہ سے تو وہ اس چھوٹی سی کتاب یعنی آلِ عمر والا صحیفہ جس کا نام میں نے نسخہ فاروقیہ رکھا ہے اس کو روایت کرتے تھے اور ایسی مبسوط کتاب کو صرف سلیمان جیسے آدمی کیلئے مختص کر دیا تھا عقل میں یہ بات نہیں آتی۔

طحاویؒ کے الفاظ یہ ہیں۔

وممایدل ایضاً علی وھاء ھذا الحدیث ان اصحاب الزھری الماخوذ عنھم مثل یونس بن یزید ومن روی عن الزھری فی ذلک شیأ انما روی عن الصحیفۃ التی عند آل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور اس حدیث کی رکاکت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ زہری کے اصحاب جن سے ان کا علم ماخوذ ہے مثلاً یونس بن یزید اور وہ لوگ جنھوں نے اس سلسلہ میں زہری سے کچھ روایت کیا ہے یہ سب اسی صحیفہ سے روایت کرتے ہیں جو آلِ عمرؓ کے پاس تھا۔

گویا طحاوی نے تنقید روایت کے اس درائتی قاعدہ کا ذکر ضمنی طور پر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیثوں کی جانچ کا ایک بڑا کلیہ قاعدہ ہے۔ ایک ہی استاد کے بڑے بڑے ارشد تلامذہ ایک ہی مسئلہ میں تو کوئی ہلکی سی دلیل سے نقل کرتے ہوں لیکن ایک معمولی آدمی اس استاد سے اس مسئلہ کے متعلق ایک ایسی چیز نقل کرتا ہو جو اس ہلکی اور سبک دلیل کے مقابلہ میں زیادہ قوت رکھتی ہو۔ غور کرنے کی بات ہے کہ عادۃً کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ طحاوی نے خود ہی اس کے بعد لکھا ہے

افتری الزھری یکون فرائض الابل عندہٗ عن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابیہ عن ابیہ عن جدہٖ وھم جمیعاً ائمۃ و اھل علم ماخوذ عنھم فیسکت ذلک و یضطرہٗ الامر الی ان یرجع الی صحیفۃ عمر غیر مرویۃ فیحدث الناس بھا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اونٹ کی زکوٰۃ کے نصاب کا بیان زہری کے پاس ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابیہ عن جدہٖ سے روایت کیا ہوا موجود ہو اور یہ سب اہلِ علم اور ائمہ ہوں مگر پھر بھی زہری سکوت کریں اور وہ مضطر ہو کر صحیفہ عمرؓ کی طرف مراجعت کریں اور لوگوں کے سامنے اس کی روایت کریں درآنحالیکہ وہ صحیفہ عمر روایت کیا ہوا نہیں

طحاوی نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ سلیمان والی روایت جو عمرو بن حزم کی کتاب سے متعلق ہے اس کے الفاظ اور اس کی سند کے رواۃ میں جو قوت ہے وہ آلِ عمرؓ کے صحیفہ میں نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ سلیمان نے زہری سے اس روایت کو بایں سند

نقل کیا ہے کہ زہری نے عمرو بن حزم کے براہ راست پوتے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے سنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابوبکر بن محمد علاوہ اس کے کہ عمرو بن حزم کے پوتے ہیں۔ امام مالک اور ان جیسے بزرگوں نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام مالک کے الفاظ یہ ہیں

ما رأیت مثل ابی بکر بن حزم اعظم — میں نے ابوبکر بن حزم جیسا کوئی آدمی عظیم المروت

مروۃ ولا اتم حالا — اور مکمل نہیں دیکھا۔

ولا رأیت من اوتی ما اوتی — نفقات مکمسا — ؟

ولی المدینۃ والقضاء والموسم — وہ مدینہ کے والی، قاضی اور امیر الحج بنائے گئے تھے

اور کیوں نہ ہو خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے قضاء کے لئے جس شخص کا انتخاب کیا ہو وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کے نام سے بخاری میں عمر بن عبد العزیز کا مشہور فرمان تدوین حدیث کے متعلق صادر ہوا تھا اور ابوبکر اس کتاب کو اپنے والد محمد سے روایت کرتے تھے اور یہ وہی محمد بن عمرو بن حزم ہیں جن کے عجیب وغریب قصے حرہ کے واقعہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یزیدی فوج سے مدینہ والے جب مقابلہ کے لئے تیار ہوئے تو انصار کے قبیلہ خزرج کے علمبردار حضرت محمد بن عمرو بن حزم ہی تھے۔

بہرحال جس پامردی سے اس ظالمانہ حملہ میں انھوں نے شہادت کا مقام حاصل کیا اس کے سوا بھی ان کے متعلق ارباب نقد کے الفاظ بہت وقیع ہیں اور ان ہی محمد نے اپنے والد عمرو بن حزم کی یہ کتاب اپنے بیٹے قاضی ابوبکر کے لئے روایت کی تھی اسی کی طرف طحاوی نے اشارہ کیا ہے۔ عن ابی بکر بن محمد عن ابیہ عن جدہ وھم جمیعا ائمۃ واھل علم متخذ عنھم۔

یہ تو سند کی قوت کا حال ہے، روایت جن صریح الفاظ میں زہری کی سند میں ہے وہ یہ ہے کہ عن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی اھل الیمن الحدیث

جس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف براہ راست یہ کتاب صاف اور صریح الفاظ میں منسوب کی گئی ہے لیکن "نسخہ فاروقیہ" کی روایت کا حال یہ ہے کہ زہری روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتے ہیں کہ

نسخة كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم — یہ اس تحریر کا نسخہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
الذی کتب فی الصدقة وهی عند — نے صدقہ کے متعلق تحریر فرمائی اور یہ تحریر حضرت
آل عمر بن الخطاب اقرءنیها سالم وعبد الله — عمرؓ کے خاندان میں موجود تھی۔ سالم اور عبداللہ دونوں
ابنا عمر۔ — نے اس کا اقرار کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ سند کے اتصال کا جو طریقہ ہے وہ اس میں نہیں ہے ایک نسخہ ہے جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا۔ کب لکھا۔ کس کے سامنے لکھا۔ کس لئے لکھا، کس کو لکھکر دیا یہ ساری باتیں بحث طلب رہ جاتی ہیں۔ طحاوی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ای صحیفة عمر غیر مرفیة یعنی منسوب تو یہ حضرت عمر کی طرف ہے لیکن زہری کی کسی سند میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کتاب کسی کو سنائی یا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انھوں نے منسوب کیا۔ زیادہ سے زیادہ تمام طریقوں میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی لڑکوں سالم اور عبداللہ سے اسے روایت کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ سند میں انقطاع پیدا ہو جاتا ہے۔ بہرحال طحاوی کو یہی کہنا ہے کہ مقابلۃً جو چیز کم ہو اور مضامین بھی اس کے کم ہیں اسے تو زہری اپنے بڑے بڑے شاگردوں سے بیان کرتے تھے اور عمرو بن حزم کی جو کتاب عن ابیہ عن جدہ کے طریقہ سے براہ ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم ملی تھی اسے ان شاگردوں سے چھپاتے تھے آخر اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں؟ کوئی شک نہیں کہ طحاوی کی درایۃً یہ تنقید بہت زیادہ محل غور و تامل ہے۔ البتہ اس پر ایک شبہ وارد ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زہری سے عمرو بن حزم والی کتاب کا اگر صرف بدنام سلیمان ہی ناقل ہوتا تو بیشک درایۃً یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلیمان کے علاوہ امام زہری کے ایک جلیل القدر

تلمیذ معمر امام اہل یمن بھی عمرو بن حزم کی کتاب کو روایت کرتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ معمر کا پایہ زہری کے شاگردوں میں کتنا بلند ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ طحاوی کا یہ سوال کہ "فرائض الابل" کے متعلق جب زہری کے پاس عمرو بن حزم کی کتاب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ موجود تھی تو پھر یونس ابن یزید نے انھوں نے اس عجیب و غریب کتاب کو کیوں چھپایا کہ وہ بیچارے اس باب میں آلِ عمر والے صحیفہ پر عمر بھر قناعت کئے رہے حالانکہ زہری سے تعلقات کی نوعیت یونس سے یہ تھی کہ زہری جب دمشق آتے تھے اور رات کو پہنچتے تو ان سے سننے والوں کا ساتھ کسی کے پاس بجز یونس کے نہیں اترتے تھے بلکہ انہی کے ساتھ اگر امام احمد بن حنبل کے اس بیان کو ملا لیجئے کہ

ما أعلم أحدا أحفظ لحديث الزهري من معمر إلا ما كان من يونس فإنه كتب كل شيء هناك (تہذیب ج ۱۱ ص ۴۵۰)	میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو زہری کی احادیث کا معمر سے زیادہ حافظ ہو بجز ان روایتوں کے جو یونس سے مروی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے تو وہ تمام روائتیں لے لی تھیں جو وہاں موجود تھیں۔

امام احمد کے اس نقدہ پر غور کیجئے کہ "کتب کل شیء هناك" یعنی جو کچھ زہری کے پاس تھا سب لکھ لیا تھا اور اس کے بعد ابو جعفر طحاوی کے اس سوال کو سامنے رکھئے کہ "ان اصحاب الزهري المأخوذ عنهم مثل يونس بن يزيد ومن روى عن الزهري في ذلك شيئا"۔

اور اس سے اندازہ کیجئے کہ رواۃ حدیث کی خصوصیتوں پر ان کی کیسی گہری نظر تھی۔ یونس بن یزید کے متعلق ان ہی محدثین کا یہ کہنا کہ جو کچھ زہری کے پاس تھا سب لکھ لیا تھا، ورنہ لکھی تو ایسی عجیب و غریب کتاب یعنی عمرو بن حزم کی کتاب کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے؟ بلاشبہ یہ ایک عجیب سوال ہے تاہم طحاوی نے اس پر بس نہیں کیا ہے۔ معمر والی سند کی طرف بھی انھوں نے توجہ منعطف کی ہے خود ہی سوال اٹھاتے ہیں کہ

فان قال قائل فان حدیث معمر — اگر کوئی کہے کہ معمر کی حدیث جو عبداللہ بن ابی بکر
عن عبداللہ بن ابی بکر حدیث — مروی ہے متصل حدیث ہے اور اس میں کسی کے لئے
متصل لا مطعن لاحد فیہ — جائے طعن نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معمر نے عبداللہ بن ابی بکر کے اضافہ کے ساتھ زہری سے جو یہ روایت کی ہے اس میں تو سلیمان نہیں ہے اور یہ بھی اسی عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے۔ بہرحال درایت والی تنقید سے قطع نظر کرکے طحاوی نے معمر والی روایت میں ایک عجیب نکتہ پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ معمر والی سند کے الفاظ یہ ہیں۔

معمر عن الزہری عن عبداللہ بن ابی بکر عن ابیہ عن جدہ ۔۔ الحدیث

پس طحاوی نے عن ابیہ عن جدہ کے الفاظ کی گرفت کی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ قاضی ابوبکر نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے عبداللہ کی طرف "عن ابیہ عن جدہ" کی ضمیریں راجع ہوں گی یعنی مطلب یہ ہوگا کہ عبداللہ نے اپنے والد ابوبکر سے ابوبکر نے عبداللہ کے جد (دادا) محمد سے یہ روایت اخذ کی ہے۔ گویا اس بنیاد پر عمرو بن حزم کی طرف جو اس روایت کی نسبت تھی وہ جاتی رہی اور محمد پر ختم ہو گئی۔

اب محمد کہتے ہیں کہ "کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی اہل الیمن"
ظاہر ہے کہ محمد کی لقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اگر ہیں تو ان کے والد عمرو بن حزم ہیں نہ کہ محمد۔ پس جس سند میں عمرو بن حزم کی طرف روایت منسوب ہے اس میں تو سلیمان بن ارقم نے آکر کام خراب کیا اور جس میں سلیمان نہیں بلکہ معمر ہیں۔ اس میں عمرو بن حزم کا نام حذف ہو کر محمد پر روایت منقطع ہو گئی۔ مذکورہ بالا اعتراض یعنی معمر والی روایت تو متصل ہے اور اس میں کسی کو اعتراض کا موقع نہیں بلکہ اس کی سند بلا طعن ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے طحاوی کہتے ہیں کہ

قیل وھو منقطع لان معمرًا رواہ — کہا جاتا ہے کہ یہ روایت متصل نہیں ہے کیونکہ معمر نے
عن عبد اللہ بن ابی بکر عن ابیہ — اس کو عبد اللہ بن ابی بکر سے انھوں نے اپنے باپ سے
عن جدہ وجدہ محمد بن ابی بکر — اور انھوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور ان
وھولم یدرک النبی صلی اللہ — کے دادا محمد بن ابی بکر ہیں اور انھوں نے آنحضرت
علیہ وسلم۔ — صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا ہے۔

اولاً اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ محمد بن ابی بکر یعنی عمرو بن حزم جن کی کنیت ابوبکر تھی اور ان کے پوتے قاضی ابوبکر کا نام بھی وہی تھا جو دادا کا تھا۔ ان محمد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا نہیں تھا۔ طحاوی نے اپنی تاریخی وسعت نظری کو ظاہر کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرو بن حزم یہ دراصل نوعمر صحابیوں میں ہیں۔ کل سترہ سال کی عمر تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نجران علاقہ یمن کا عامل بنا کر بھیجا تھا جس کا پہلے بھی ذکر آیا ہے اور نجران ہی میں سنہ میں ان کے صاحبزادے محمد پیدا ہوئے اور یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکے۔

اب اسی واقعہ کو طحاوی سامنے رکھتے ہیں اور روایت پر جرح کرتے ہیں۔ پہلی جرح تو ان کی یہی ہے کہ اس کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اس وقت لکھوایا تھا جب محمد پیدا کیا ہوئے ہوں گے، ان کے والد نجران ہی نہیں گئے تھے معمر والی روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ ان کے والد عمرو بن حزم نے ان سے یہ کتاب روایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ محمد اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہاں طور منسوب کرتے ہیں کہ جس شخص کے سامنے یہ کتاب لکھی گئی جسے دی گئی اس کا ذکر درمیان سے غائب ہے۔ وہ شوافع انقطاع کے جس عیب سے حدیثوں کو رد کرنے کے عادی ہیں وہی عیب تو اس میں بھی موجود ہے

طحاوی کے الفاظ یہ ہیں۔

محمد بن ابی بکر لم یر النبی صلی اللہ	محمد بن ابی بکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں
علیہ وسلم ولا ولد الا بعد ان کتب	دیکھا اور ان کی تو ولادت بھی اس واقعہ کے بعد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذا الکتاب	ہوئی ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
لابیہ لانہ انما ولد بنجران قبل وفات	ان کے باپ کو یہ تحریر لکھوائی تھی کیونکہ یہ سنہ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ عشر من	میں وفات نبوی سے قبل نجران میں پیدا
الھجرۃ ولم ینقل فی ھذا الحدیث	ہوئے تھے۔ اور اس حدیث میں یہ بیان نہیں
ان محمد بن عمرو بن حزم رواہ	کیا گیا کہ محمد بن عمرو بن حزم نے اس حدیث کو
ھذا الحدیث عن ابیہ۔	اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔

اور اس کے بعد حدیث پر حکم لگاتے ہیں کہ

فقد ثبت انقطاع ھذا الحدیث ایضاً	پس اس حدیث کا بھی انقطاع ثابت ہو گیا۔

لیجئے زہری کی پہلی حدیث کو سلیمان نے ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا اور معمر والی سند اس اعتراض سے تو محفوظ تھی لیکن طریقۂ ادا معمر نے ایسا اختیار کیا کہ انقطاع کا عیب حدیث میں پیدا ہو گیا۔

بیہقی جب طحاوی کی اس گرفت پر مطلع ہوئے ہیں تو عجب انداز میں فرماتے ہیں کہ۔

واما حدیث الصدقات فلہ اصل فی بعض	اور رہی حدیث صدقات تو معمر کی بعض روایتوں
ما رواہ معمر عن الزہری عن ابی بکر بن محمد بن	میں اس کی اصل موجود ہے لیکن معمر نے اس کی
عمرو بن حزم فافسد اسنادہ۔ (سنن ج ۴ ص ۸۹)	سند فاسد کردی ہے۔

بیہقی نے اپنے اس نوٹ میں ایک تو یہ نہیں بتایا کہ معمر نے اس سند کو کس طرح بگاڑ دیا اور بگاڑ کی گرفت جس سے ہو سکتی تھی اس کو عنعنہ کی آڑ میں چھپا دیا یعنی معمر عن الزہری عن ابی بکر بن محمد الخ

کہدیا۔ حالانکہ زہری کے بعد معمر والی روایت میں عن عبداللہ بن ابی بکر عن ابی بکر عن ابیہ عن جدہ ہے بہرحال یہی غنیمت ہے کہ معمر کے طرز بیان سے سند کے الفاظ میں انقطاع کی جو گنجائش نکل آئی اس کا بیہقی نے اقرار تو کرلیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طحاوی اس روایت کو واقع میں رد کرنا نہیں چاہتے لیکن خصم جس طریقہ سے اپنے مخالفوں کی روایتوں میں نقص نکالکر ناقابل احتجاج ہونے کا فیصلہ کردیتے ہیں اسی طریقہ کو ازراہ الزام انھوں نے یہاں اختیار فرمایا ہے آخر میں خود فرماتے ہیں کہ

والمنقطع فانتم لاتحتجون بہ — اور منقطع سے تو تم لوگ احتجاج نہیں کرتے

عجب وہی ہے کہ حدیث احتجاج کے قابل رہتی ہے یا نہیں مجھے اس سے بحث نہیں بلکہ آپ حضرات کا جو مذاق ہے اس کا اقتضاء تو یہی ہے کہ اس حدیث سے بھی دست بردار ہوجائیے۔ تعجب ہے کہ بیہقی بجائے اس کے کہ انقطاع کے عیب ہونے کے اصول کا انکار کرکے یہ کہدیتے کہ انقطاع سے قطع نظر دوسرے قرائن تو ایسے ہیں جن سے اس حدیث کی توثیق ہوتی ہے لیکن چونکہ اپنی بات جاتی ہے۔ اور ایک جگہ اگر اس اصولی کو مان لیا جائے تو حنفیوں کی سینکڑوں وہ دلیلیں جو انقطاع کی تلوار سے ذبح ہوئی ہیں معاذ زندہ ہوجاتی ہیں۔ اسی لئے علامہ بیہقی نے انقطاع کے عیب کو برقرار رکھتے ہوئے معمر کی روایت سے دست برداری کرلی اور اسی سلیمان والی مجروح روایت میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے اور اطمینان سے فرماتے ہیں کہ معمر نے تو خیر سند بگاڑ دی لیکن

حدیث سلیمان بن داؤد مجود الاسناد — سلیمان بن داؤد کی حدیث عمدہ اسناد والی ہے

مگر گزر چکا کہ کاش سلیمان سلیمان بن داؤد ہی ہوتا۔ کیا بیہقی صالح جزرہ اور ابن مندہ کے انکشافات سے ناواقف ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے ان جیسا متبحر محدث اتنی معمولی بات سے بے خبر ہوسکتا ہے؟ لیکن۔

عالم بے خبری میں ہے نہایت آرام — کیف کیوں ہوش میں آتے ہو یہ کیا کرتے ہو

اور یہ تو شوافع کے دعوے کے پہلے جز یعنی "الاثار المتصلۃ شاھدۃ لقولنا" کی تنقید اسماء الرجال واصول حدیث کے ضوابط کی روشنی میں تھی الطحاوی نے یہ لکھ کر کہ

فقد ثبت ان کل ما روی عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب منقطع۔ یہ ثابت ہوگیا کہ اس باب میں جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ سب منقطع ہے۔

اور اس کے بعد انھوں نے وہی باتیں انقطاع کے متعلق کہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی ایک جگہ جب منقطع روایت سے آپ لوگوں نے فائدہ اٹھا لیا تو اب دوسری جگہ کسی دوسرے کو ٹوکنے کا حق باقی نہ رہا اور دراصل ان سارے مباحث سے ان کی غرض یہی تھی۔

اس کے بعد وہ دعوے کے دوسرے جز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی "ولیس ذلک مع مخالفنا" اس سلسلہ میں جو بات کہی گئی ہے اس کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں پہلے بھی کہہ آیا ہوں کہ عمرو بن حزم کی کتاب الصدقات کے الفاظ ایک تو وہ تھے جو زہری کی سند سے منقول ہیں ان سے شوافع کی تائید ہوتی ہے۔ اس سند کا حال تو معلوم ہی ہو چکا اب ان ہی عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب کا ایک اور نسخہ بھی ہے۔ یہ نسخہ قیس بن سعد کے نام سے مشہور ہے۔ قیس نے اس نسخہ کو قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے بایں الفاظ حاصل کیا تھا کہ

اخبرنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھکو بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کتبہ لجدہ عمرو بن حزم۔ ان کے دادا عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا۔

اور قیس سے اس نسخہ کو وہی حماد بن سلمہ نے (جن کا ذکر پہلے بھی قاضی ثمامہ کی حدیث میں گزر چکا ہے) اس طریقہ سے حاصل کیا تھا جسے وہ خود ہی بیان کرتے تھے۔

قلت لقیس بن سعد اکتب لی کتاب میں نے قیس بن سعد سے کہا کہ میرے لئے ابوبکر بن محمد کی ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم فکتبہ لی کتاب لکھ دیجئے۔ تو انھوں نے اس کو میرے لئے ایک ورقہ میں

فی ورقۃ ثم جاء بھا وخبرنی انہ الخ لکھدیا پھر وہ اس کو لیکر آئے اور انھوں نے بتایا کہ...

یعنی اس کے بعد وہی الفاظ جو قیس کی زبانی ہم نے پہلے نقل کئے ہیں قیس نے بیان کئے۔

عمرو بن حزم کے اس نسخہ میں جو حساب بل سائمہ کی زکوٰۃ کا درج ہے وہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے شوافع یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ یہ روایت ثابت نہیں ہے کیونکہ طحاویؒ نے اپنی خاص سند سے اس کو جو نقل کیا ہے اس کے سوا بھی ابوداؤد کی کتاب المراسیل میں صحیح سند سے حماد بن سلمہ عن قیس بن سعد کے ذریعہ سے یہ حدیث مروی ہے اس لئے شوافع نے اپنی وہی پرانی ترکیب انقطاع والی اس میں بھی چلائی

پہلا اعتراض تو ان کا یہی ہے کہ اس نسخہ کو قاضی ابوبکر نے بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ ان کے دادا عمرو بن حزم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا کر دیا تھا اور یہ مسلم ہے کہ ابوبکر کی ملاقات ان کے دادا عمرو بن حزم سے ثابت نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ روایت منقطع ہے۔ بیہقی اسی اعتراض کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں

وھو منقطع من ابی بکر بن حزم فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مطلب وہی ہے کہ ابوبکر کی ملاقات جب عمرو بن حزم اپنے دادا سے نہ تھی تو اس کتاب کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے طریقہ سے کیا گیا ہے جس میں درمیان کے راوی سے براہ راست یہ کتاب نہ سنی گئی نہ لی گئی۔ دوسرا اعتراض یہ ہے جسے بیہقی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

وقیس بن سعد اخذہ عن کتاب لا عن سماع وکذلک حماد بن سلمۃ اخذہ عن کتاب لا عن سماع۔

قیس بن سعد نے اس کو کتاب سے لیا ہے سماع سے نہیں اور اسی طرح حماد بن سلمہ نے اس کو کتاب سے لیا ہے سماع سے نہیں۔

دراصل طحاوی نے قاضی ثمامہ اور زہری دونوں کی روایتوں میں جو انقطاع ثابت کیا ہے وہ اس زبردستی کا جواب ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ابوبکر بن محمد کو بالاتفاق تمام محدثین جلیل القدر ائمہ حدیث میں مانتے ہیں۔ گزر چکا کہ ان ہی کے نام عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان تدوین حدیث کے متعلق

شرف صدور لایا تھا۔ اگر نا قابلِ اعتماد آدمی ہوتے تو کیا ان کے ذمہ اتنا اہم کام عمر بن عبدالعزیز جیسے محتاط خلیفہ کر سکتے تھے۔ وہ براہِ راست اپنے دادا کی کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف یہ نہیں بتاتے کہ کس نے ان کو کہا کہ یہ وہی کتاب ہے جو تمہارے دادا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا کر دی تھی۔ بس اتنی سی بات تھی جس کے لئے حدیث ناقابلِ احتجاج ہو گئی حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک تواتر سے ان کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ میرے دادا کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کتاب لکھوا کر دی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ باوجود ھم من عدال ہونے کے وہ یہ کہنے کی جرأت کریں کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتبہ لجدہ۔

مگر یہاں اس سے کیا بحث ہے۔ صرف انقطاع کے لفظ پر اصرار مقصود ہے اور یہی حال دوسرے اعتراض کا ہے۔ آپ دیکھ چکے کہ قیس سے حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی جو کتاب ہے وہ مجھے لکھ کر دیجئے۔ قیس ان کو ایک دفعہ میں لکھ کر دیتے ہیں اور دیتے ہوئے کہتے ہیں "قاضی ابوبکر نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو میرے دادا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا کر دی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ خود اس لکھی ہوئی عبارت کو قیس نے حماد کو پڑھ کر نہیں سنایا لیکن دونوں محدث تھے۔ دونوں لکھنا پڑھنا جانتے تھے محض ایک رسمی بات کہ پڑھ کر نہیں سنایا اس لئے اس کی تعبیر کر دی گئی کہ حدیث نہ قیس نے ابوبکر سے سنی اور نہ حماد نے قیس سے۔ بلکہ ہر دو کو صرف کتاب ملی۔ اور اسی رسمی سماع کے فقدان کو گویا عدم اتصال روایت کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ انصاف شرط ہے کہ اگر اسی قسم کی زبردستیوں کے مقابلہ میں طحاوی نے بھی شوافع کی کل دلیلوں کو منقطع کر کے رکھ دیا اور کہیں کہیں کچھ زیادہ دباؤ سے کام لیا ہے تو جو زیادتی شوافع کی طرف سے عمل میں آئی ہے یقیناً اس کے مقابلہ میں طحاوی کی زیادتی زیادتی نہیں۔ طحاوی نے دراصل اسی کی طرف اپنے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ

فقد ثبت ان کل ما نروی عن رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب منقطع۔

یعنی جیسے ہماری روایت کو جب اس طریقے سے آپ لوگوں نے منقطع کرنے کی کوشش کی ہے تو ہم بھی

منقلب ثم شکست من سیر او سن بالسن والجروح قصاص

پر عمل کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ انقطاع کا موثر عیب جتنا طحاوی نے شوافع کے مسندات میں نکالا

ہے۔ قیس بن سعد والی روایت میں اس قسم کا موثر انقطاع قطعاً نہیں ہے بلکہ صرف لفظی اور اصطلاحی

انقطاع اس کو کہا جا سکتا ہے اس لئے صاحب جوہر النقی نے لکھا ہے کہ

والاخذ بالکتاب حجۃ وصرح البیہقی اور کتاب کا اخذ کرنا حجت ہے اور بیہقی نے مدخل میں تصریح

فی المدخل ان الحجۃ تقوم بالکتاب۔ کی ہے کہ کتاب سے حجت قائم ہو جاتی ہے۔

حضرت محدث کشمیری سے بھی یہی منقول ہے کہ

ان مثل ھذہ الکتب معتبرہ (العرف الشذی ص ۲۷۰) اس طرح کی کتاب معتبر ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ جس قسم کی کتابت یہاں ہوئی ہے کون ایسا ہوگا جو سماع سے کمتر

قرار دے سکتا ہے۔ یوں تو وسوسہ پیدا کرنے کے لئے سماع میں بھی سینکڑوں گنجائشیں ہیں۔ مقصود تو

حصول ظن غالب ہے سماع سے ہو تو کیا اور کتابت سے ہو تو کیا اور کوئی شبہ نہیں کہ جس طریقہ سے یہاں

کتابت ہوئی ہے اس سے ظن غالب ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ بات طول ہو جائے گی ورنہ

کتابت کے متعلق بھی ائمہ حدیث کے نقول کو پیش کر کے میں بتاتا کہ قیس کی روایت والی کتاب سماع

سے کسی طرح کم نہیں ہے مگر شوافع نے صرف اسی جرح بالانقطاع پر کفایت نہیں کی بلکہ آگے بڑھ کر

ان لوگوں نے وہی زہری والی روایت کو پیش کر کے استدلال کی نئی صورت نکالی۔ طحاوی نے ان کے

اس طریقہ استدلال کو بایں الفاظ نقل کیا ہے۔

فان قال قائل اما حدیث عمرو بن حزم اگر کوئی کہے کہ عمرو بن حزم کی حدیث تو مضطرب ہے اور
فقد اضطرب واختلف فیہ فلا حجۃ فیہ اور اس میں اختلاف ہے اس لئے وہ ان ارباب
لاحد من اھل ھذہ المقالات ۔ مقالات میں سے کسی کے لئے حجت نہیں بن سکتی ۔

مطلب یہ ہے کہ عمرو بن حزم کی ایک روایت تو قیس بن سعد والی ہے جس سے حنفیوں کی تائید ہوتی ہے لیکن اس عمرو بن حزم کی کتاب کا جو نسخہ زہری سے منقول ہے اس سے شوافع کی تائید ہوتی ہے" فاذا تعارضا تساقطا"۔

طحاوی اس کے بعد کہتے ہیں کہ وغیرہ مما روی فی ھذا الباب اولی منہ" یعنی عمرو بن حزم کی کتاب سے دونوں استدلال ترک کردیں اور آل عمر کے صحیفہ یا صدیقیہ نسخہ وغیرہ سے استدلال کیا جائے اور وہ تو شوافع کے مطابق ہے۔ تعارض کے اس دعوی پر طحاوی ذرا برہم ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

قیل لہ من این اضطرب حدیث اس سے پوچھا جائے کہ عمرو بن حزم کی حدیث
عمرو بن حزم ۔ میں اضطراب کہاں ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ کجا زہری والی روایت جس کی ایک سند ہے تو وہی سلیمان بن ارقم مشہور بدنام راوی ہے اور بڑی مشکل سے پتہ چلایا گیا کہ وہ سلیمان بن داؤد نہیں ہے۔ آپ اس سے مقابلہ کررہے ہیں۔ اس روایت کا جسے قیس بن سعد جیسا معتبر راوی نقل کررہا ہے۔ کون قیس بن سعد جو امام مکہ عطاء کی جانشینی کرتے تھے۔ ابن جریج جیسے ثقہ راوی کا مقابلہ کرکے مشہور صاحب سنن ابوداؤد سے کسی نے پوچھا کہ عطاء کے شاگردوں میں کسے فضیلت حاصل ہے۔ ابوداؤد نے لطیف جملہ میں جواب دیا کہ

کان قیس اقدم وابن جریج یقدم قیس سب سے پیشرو تھے اور ابن جریج کو آگے کیا جاتا تھا

خود بڑھ جائے اور بڑھایا جائے میں ظاہر ہے کہ بڑا فرق ہے۔ بہرحال بلا اختلاف حافظ نے نقل کیا ہے کہ امام احمد و ابوزرعہ و یعقوب بن شیبہ و ابوداؤد سب ان کو ثقہ کہتے تھے۔ ابن معین کے

نزدیک وہ "لیس بہ باس" کا مصداق ہیں۔ بظاہر اس قسم کی اتفاقی توثیق کم ہی خوش نصیبوں کو میسر آتی ہے۔ پس کہاں قیس بن سعد اور ان کی روایت اور کہاں زہری والی اس سند والی روایت۔ طحاوی نے اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

اما قیس بن سعد فقد رواہ عن ابی بکر قیس بن سعد نے تو اس کو ابوبکر . . . .

بن محمد بن عمرو بن حزم علی ما قد ذکرنا . . . . . سے روایت کیا ہے اور قیس

عنہ وقیس بن سعد حجۃ حافظ بن سعد حجت اور حافظ ہیں۔

یہ تو قیس اور ان کی روایت کا مقام ہے۔ اس کے مقابلہ میں الزہری والی روایت کے متعلق لکھتے ہیں۔

واما حدیث الزھری الذی خالفہ فانما رہ گئی زہری کی حدیث جو اس کے مخالف ہے تو وہ زہری

رواہ عن الزھری من لا تقبلون انتم ہے ایک ایسے شخص نے روایت کی ہے جس کی روایت کو

روایتہ عن الزھری بضعفہ عندکم تم خود بوجہ بزعم شما ضعیف ہونے کے تم قبول نہیں کرتے"

یعنی وہی سلیمان بن ارقم والی روایت۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ایسے جلیل القدر محدث یعنی قیس کی روایت کو سلیمان کی روایت سے ٹکرایا جاتا ہے اور گرایا جاتا ہے البتہ معمر والی سند سے زہری کی روایت میں اگرچہ انقطاع تو طحاوی ثابت کر چکے تھے لیکن انقطاع کا عیب کم از کم فریق مخالف کے نزدیک قیس کی روایت میں بھی ہے پھر اس سے تصادم کر کے تساقط کا کام کیوں نہیں لیا جا سکتا پس یہی مقام ہے جہاں طحاوی نے اپنی ذہانت کے سوا اپنے معلومات کی وسعت کا ثبوت پیش کیا ہے مقصد یہ ہے کہ معمر والی روایت میں یہ بات گزر چکی کہ زہری سے معمر اس روایت کو بجائے قاضی ابوبکر کے ان کے بیٹے عبداللہ کے واسطے سے نقل کرتے تھے۔ اب طحاوی دکھانا چاہتے ہیں کہ ان عبداللہ بن ابی بکر اور قیس بن سعد میں کیا نسبت ہے۔ قیس کا حال تو گزر چکا کہ "حجۃ حافظ" ہیں۔ اس کے مقابلہ میں عبداللہ بن ابی بکر کا حال طحاوی ہی کی زبانی سنئے۔ کہتے ہیں۔

حدثنی یحیی بن عثمان قال سمعت ابن الوزیر یقول سمعت الشافعی یقول سمعت سفیان بن عیینہ یقول کنا اذا رأینا الرجل یکتب الحدیث عن واحد من اربعۃ و ذکر فیھم عبداللہ بن ابی بکر سخرنا منہ لانھم کانوا لا یعرفون الحدیث

یحیی بن عثمان بیان کرتے ہیں انھوں نے ابن الوزیر سے سنا تھا اور انھوں نے امام شافعی کو یہ فرماتے سنا تھا کہ میں نے سفیان بن عیینہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جب ہم کسی شخص کو دیکھتے تھے کہ وہ چار آدمیوں میں سے کسی ایک سے روایت کر رہا ہے اور ان چاروں میں عبداللہ بن ابی بکر بھی شامل تھے تو ہم اس کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ یہ لوگ حدیث کو نہیں پہچانتے تھے۔

لیجئے دوسرے کی نہیں خود امام الشوافع حضرت امام شافعیؒ کی شہادت ہے کہ معمولی آدمی نہیں مدار الحدیث سفیان بن عیینہ کا عبداللہ بن ابی بکر کے متعلق بیان ہے کہ ان سے حدیث پڑھنے والوں کا لوگ مذاق اڑاتے تھے کیونکہ ان کو حدیث کے فن سے واقفیت نہ تھی۔ طحاویؒ امام شافعیؒ کی اس شہادت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فلما لم یکافی عبداللہ بن ابی بکر قیسا فی الضبط والحفظ صار الحدیث عندنا علی ما رواہ قیس لاسیما وقد ذکر ان ابابکر بن محمد کتبہ لہ

جب عبداللہ بن ابی بکر ضبط اور حافظہ میں قیس کے برابر نہ ہوئے تو ہمارے نزدیک حدیث قیس کی روایت کے مطابق ہی ہوگی خصوصاً اس لئے کہ ابوبکر بن محمد نے اس کو ان (قیس) کے لئے لکھا تھا۔

یعنی تساقط کا عمل تو جب جائز ہو سکتا ہے جب تعارض بھی ہو۔ خاک کا عالم پاک سے کیا تعارض ہے۔ کجا قیس بن سعد خلیفۂ عطاء امام مکہ اور کجا عبداللہ بن ابی بکر جن سے پڑھنے پر محدثین تمسخر کرتے ہوں۔

آخر میں ایک اور لطیف اضافہ طحاوی نے کر دیا اور وہ وہی بات ہے جو میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ کتابت ہر حال میں سماع سے کمتر نہیں سمجھی جاتی بلکہ ایک ہی مدعا کو آدمی چاہے زبان سے تلفظ کر کے

سنائے یا ایسا آدمی جو پڑھنا جانتا ہو بجائے بولنے کے لکھکر وہی بات بتائے۔ عملاً و نتیجۃً دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے

"کتبہ لہ" یعنی قاضی ابوبکر نے قیس ہی کے لئے لکھکر دیا اور قیس نے حماد بن سلمہ کو لکھکر دیا۔ ان ہی کے لئے لکھا، اس میں اور سماع میں کوئی فرق نہیں ہے۔ متن نہیں بلکہ سند کے متعلق امام طحاوی کی فن دانی اور ماہرانہ حذاقت کے ثبوت میں یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو ان کی کتاب "معانی الآثار" کے بعض جستہ جستہ مقامات سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ

(۱) رواۃ حدیث کے اساتذہ اور تلامذہ دونوں سلسلوں سے طحاوی خوب واقف تھے۔

(۲) ان کو اس کا بھی علم تھا کہ استاذہ کے ساتھ ان کے مختلف تلامذہ کو کیا نسبت ہے یعنی کن استادوں کے کن کن شاگردوں کو ان کی حدیثوں کے متعلق اہمیت حاصل ہے کہ اس علم پر متون حدیث کے زیادات کی صحیح تنقیح ممکن ہے۔

(۳) وہ رواۃ کے سنین ولادت و وفات سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔

(۴) سب سے اہم چیز فن اسناد میں حدیث کی علت کی واقفیت ہے۔ ان لوگوں کے سوا جو اس فن کے نقاد کہلاتے ہیں۔ عامی آدمی کی نظر ان مخفی علل کی طرف نہیں جا سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ زہری کا اپنے جلیل القدر تلامذہ سے صرف آل عمر کے صحیفہ کی روایت اور غیر اہم تلامذہ کا عمرو بن حزم کے اس نسخہ کا تذکرہ جس سے شوافع کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں جو علت طحاوی نے نکالی ہے وہ کتنی دقیق ہے اور علم اسماء الرجال کی کتنی وسیع معلومات پر ان کا یہ فیصلہ مبنی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے فیصلوں پر ان ہی لوگوں کی رسائی ممکن ہے جن کا پایہ اس فن میں غیر معمولی طور پر بلند ہو۔

(۵) ایسی حدیثیں جن کے انقطاع کی طرف عام نگاہوں کو توجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ عام علماء شافعیہ ہمیشہ ان سندوں کو متصل ہی سمجھتے رہے لیکن طحاوی نے جن عالمانہ نکات کو پیش کر کے

ان ہی متصل سندوں کا انقطاع ثابت کیا ہے کیا اس کے بعد بھی ان کی مہارت وحذاقت کا کوئی انکار کرسکتا ہے۔

اور یہ تو چند مثالیں ہیں اگر استیعاب کا ارادہ کیا جائے تو صرف ان کی ان ہی دونوں مطبوعہ کتابوں سے اس قسم کے محدثانہ مباحث کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کردیا جاسکتا ہے جس سے ایک مستقل ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ معانی الآثار سے زیادہ اس قسم کا سرمایہ مشکل الآثار میں موجود ہے میرا مقصد چونکہ صرف اس قدر ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے طحاوی کے متعلق جو یہ دعوی کیا ہے کہ امام طحاویؒ کو علم الاسناد میں اس فن کے علماء کا سا درک نہیں تھا۔ اہل انصاف اندازہ کریں کہ ابن تیمیہ کا یہ دعوی کہاں تک اصلیت پر مبنی ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ابن تیمیہ کے اس دعوی پر تو صرف تنقید کی ہے کہ امام ابن تیمیہ نے اس میں بھی اپنی عادت کے مطابق تنقید کی ہے (الدرۃ البہیہ ص ۱۸) لیکن میرا تو خیال ہے کہ مبالغہ ہی نہیں بلکہ اگر معاف کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ دعوی ناواقفیت پر مبنی ہے اور

ولا تقف مالیس لك به علم۔ جس چیز کا تم کو علم نہ ہو اس کا اتباع نہ کرو۔

کے قرآنی فرمان کی خلاف ورزی ہے اور اگر واقفیت کے باوجود حافظ ابن تیمیہ نے اس دعوی کی جرارت کی ہے تو پڑھنے والے قرآنی آیت

وجحدوا بها واستیقنتها انفسهم وہ اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان کے نفوس کو اس کا یقین ہے

سے ان کے اس دعوی کی اگر توجیہ کریں تو میں نہیں سمجھتا کہ ان کو کس بنیاد پر مطعون کیا جاسکتا ہے۔ آخر انھوں نے بھی تو اسلام کے ایک فاضل جلیل خادم حدیث نبوی پر اس قسم کا حملہ کیا ہے۔ سلف کے احترام کو اگر انھوں نے ملحوظ نہیں فرمایا تو

تو بجائے پدر چہ کردی خیر کہ ہماں چشم داری از پسرت

امام طحاوی کے دوسرے فنی کمالات

معرفۃ الاسناد کے متعلق غالباً ایک مختصر مقالہ کی حیثیت سے میرا اتنا بیان کافی ہوسکتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ الآثار والحدیث کے متعلق طحاوی کے اس خاص کمال کے چند نمونے پیش کروں جو ان کا خاص حصہ ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ متعارض حدیث و آثار میں ترجیح دینے کا ایک طریقہ تو وہی ہے جو عموماً محدثین میں رائج ہے۔ یعنی بجائے متن پر غور کرنے کے صرف حدیث کی سند اٹھالی جاتی ہے اور رواۃ حدیث کے رجسٹر (یعنی اسماء الرجال) کو سامنے رکھکر کیا جاتا ہے جو کچھ بھی کیا جاتا ہے اس کی یہ داستان بہت طویل ہے۔ بڑی طوالت ہوجائیگی ورنہ میں یہ دکھاتا کہ اس راہ سے حدیثوں کی ترجیح کا طریقہ جو عموماً محدثین اور خصوصاً شوافع میں مروج ہے اس میں کتنی غیر ذمہ داریوں سے کام لیا گیا ہے۔ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور اس کا ثبوت ان لوگوں کے طرز عمل میں ملتا ہے کہ تنقید کے بعد ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ ترجیح کے بعد عموماً اسی ترجیح کے دعوی کی تصحیح کے لئے تنقید سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ایک ہی راوی ہے جس کی ایک جگہ توثیق کی گئی ہے اور زور شور سے اس کے متعلق تمام تعدیلی کلمات جمع کردیئے گئے ہیں اور یہ وہاں کیا جاتا ہے جہاں اس راوی کی تعدیل سے کام چلتا ہوا اور وہی راوی بیچارہ دوسری جگہ آتا ہے۔ تمام جرحی الفاظ اس کے متعلق اکٹھے کردیئے جاتے ہیں۔ ہنگامہ کردیا جاتا ہے کہ یہ راوی معتبر نہیں ہے اس کا تماشا اگر کسی کو پر لطف طریقہ سے دیکھنا منظور ہو تو انتر کمانی کی الجوہر النقی کا سنن بیہقی کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرے۔ ابھی ابھی "صدقات الابل" والے خلافیہ کے سلسلہ میں حماد بن سلمہ کا نام گزر چکا ہے۔ نسخہ صدیقیہ کی توثیق کے لئے البیہقی کو ضرورت ہوئی۔ یہاں حماد بن سلمہ والی روایت کو نقل کرکے بغیر کسی دھندغے کے لکھتے ہیں کہ

اسنادہ صحیح وکلھم ثقات — اس کی اسناد صحیح ہے اور یہ کل ثقات ہیں۔

یعنی حماد بن سلمہ کا تمار یہاں ثقات میں کیا گیا ہے۔ انتر کمانی لکھتے ہیں کہ کتاب الطہارۃ میں ان ہی

بیہقی صاحب نے دوسرے موقعہ پر جہاں حماد کی روایت ان کے مدعا کے مخالف تھی سند کو ان الفاظ میں درج کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ

حماد بن سلمہ عن ابی نعامۃ السعدی عن ابی نضرۃ کل منھم مختلف فی عدالتہ	ان میں سے ہر ایک کی عدالت میں اختلاف ہے۔

دیکھئے ابھی تو حماد کا شمار "ثقات" میں تھا اور پھر دوسری سند میں بھی حماد آئے تو "مختلف فی عدالتہ" ہو گئے

اس کتاب "صدقات الابل" میں قاضی ثمامہ والی روایت جس میں عبداللہ بن المثنی بھی سند میں آتے ہیں بیہقی نے اس باب میں عبداللہ بن المثنی کی اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

حدیث ثمامۃ بن عبداللہ بن انس عن انس من اوجہ صحیحۃ ثمامہ کی حدیث وجوہ صحیحہ میں سے ہے

مگر بیہقی تو عبداللہ بن المثنی کی روایت کو "اوجہ صحیحۃ" میں قرار دیتے ہیں۔ ترکمانی نے دکھایا ہے کہ اس حدیث کے متعلق ابن معین سے پوچھا گیا تو مقدسی نے اطراف میں لکھا ہے جواب یہ ملا کہ

حدیث ثمامۃ عن انس فی الصدقات لا یصح ولیس بشئ۔	صدقات کے بارہ میں ثمامہ کی انس سے روایت صحیح نہیں ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

عبداللہ بن المثنی حالانکہ بخاری کے رواۃ میں ہیں لیکن الساجی سے ترکمانی نے نقل کیا ہے وہ عبداللہ کے متعلق کہتے تھے کہ "ضعیف منکر الحدیث" ابوداؤد کا قول تو پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ وہ "لا اخرج حدیثہ" کہتے تھے۔ ابن الجوزی نے کتاب الضعفاء میں نقل کیا ہے کہ

قال ابو سلمۃ کان (عبداللہ بن المثنی) ضعیفا فی الحدیث

وہی عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم جن کا ذکر ابھی گزرا ہے کہ امام شافعیؒ ابن عیینہؒ سے نقل کرتے تھے کہ ان سے جو حدیث پڑھتا تھا ان پر لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ یہ تو ابن عیینہ کی روایت ہے اور سلسلۃ الذہب کے راوی زہری سے کسی نے عبداللہ بن ابی بکر کے متعلق پوچھا تو بولے

علماء مدینہ کے بے نظیر عالم ہیں۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ جس شہر میں ان کے والد کی علمی عظمت قائم ہے۔ اسی شہر میں والد کی زندگی میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی عظمت کا جھنڈا بلند کریں۔ غور کیجئے کہاں ان کے درس کے ساتھ تسخہ کہاں ان کا فقید النظیر عالم مدینہ ہونا۔

واقعہ یہ ہے کہ ترجیح کا یہ طریقہ جو محدثین اور شوافع نے اختیار کیا ہے اسی قسم کے تناقض تضاد اور بوالعجبیوں سے بھرا ہوا ہے۔ بڑی حذاقت اور انتہائی ماہرانہ سلیقہ کی ضرورت ہے جب کہیں اس راہ میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ الجرح والتعدیل کا یہ باب علم الاسناد کے ان مشکلات میں ہے جس پر ضرورت ہے کہ نئے سرے سے نظر ڈالی جائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسماء الرجال کی مساعی بے کار ہیں وہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے جو صرف مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے لیکن اس سے ترجیح کے سوا اور دوسری ضرورتوں میں اگر کام لیا جائے تو وہ بلاشبہ عجیب وغریب چیز ثابت ہوتی ہے اور ترجیح روایات میں بھی کام لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے ضوابط وکلیات کے دقائق پر جن کی نظر ہے وہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں لیکن عام شوافع اور محدثین نے جو طرز عمل اس فن کے استعمال میں اختیار کر رکھا ہے اگر ادب مانع نہ ہو تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس فن کو ایک بازیچۂ اطفال بنا دیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا چند سرسری مثالوں سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ میرا یہ مضمون نہیں ہے ورنہ بحمداللہ بتایا جاتا کہ اس فن سے انتفاع کے بہترین طریقے کیا ہیں اور ترجیح روایات میں بھی ان سے استفادہ کی حکیمانہ راہ کیا ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ احناف میں یہ طریقہ مقبول نہیں ہے بلکہ سیدھی اور صاف بات ہم حنفیوں کے پاس یہ ہے کہ "احکامی احادیث" جن کا اصلی سرمایہ مشکل پانچسو حدیثوں سے متجاوز ہوتا ہے ان میں ایک حصہ تو اتفاقیات کا ہے ان میں ترجیح کی ضرورت ہی سرے سے واقع نہیں ہوتی۔ کچھ حصہ جو خلافیات سے متعلق ہے ان کا حال یہ ہے کہ عموماً چونکہ وہ عملی چیزیں ہیں اس لئے طبقہ بعد طبقہ ہر جگہ کے لوگ

ان سے عموماً واقف ہوتے تھے۔ یہ خیال کہ ان حدیثوں میں بھی بعض حدیثیں ایسی ہیں جن سے علماء امصار ناواقف تھے۔ میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ تابعین وتبع تابعین والذین اتبعوھم باحسان کے زمانہ میں عموماً علماء ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ علی الخصوص مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تو حج و زیارت کی وجہ سے سب ہی کا اجتماع ہوتا تھا۔ ان میں علمی مذاکرہ کے سوا اور کسی چیز کا ذکر ہی کب ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اختلافی مسائل کی متعلقہ حدیثوں کا علم تقریباً سب کو ہی ہوتا تھا۔ یعنی مخالف وموافق آثار واحادیث سے کوئی ناواقف نہ تھا۔ اور باوجود اس علم کے رجالی ترجیح نہیں بلکہ ترجیح کے دوسرے ذرائع سے ان پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی ترجیحی شکل کو وہ اپنا معمول بہ بناتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی رائے کا فتویٰ دیتے تھے۔ محدثین نے اسی طریقۂ ترجیح کو "الرائے" کے لفظ سے بدنام کر رکھا ہے یعنی رجحہ والی ترجیح سے ہٹ کر متعارض روایات میں جو لوگ ترجیح کے دوسرے طریقے استعمال کرتے تھے ان کے اس طرز عمل کا نام "الرائے" ہے۔ ان لوگوں کا نام "اصحاب الرائے" رکھ دیا گیا اور اس لفظ کو اتنا رسوا کیا گیا کہ گویا قریب قریب اس کی حیثیت ایک گالی کی ہوگئی ہے۔ حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ رجحہ والی ترجیح خصوصاً اس کے برتنے کا جو طریقہ محدثین نے اختیار کر رکھا ہے اس میں کتنی سخت کمزوریاں ہیں مگر اس کا نام محدثانہ طرز عمل رکھا گیا اور جنھوں نے اس طریقہ کی نزاکتوں سے پریشان ہو کر دوسری راہیں اختیار کیں ان کا نام اصحاب الرائے رکھ دیا گیا۔

میں اب آپ کے سامنے طحاویؒ کے کلام سے ان ہی ترجیحی طریقوں کی کچھ مثالیں پیش کرونگا معلوم ہو کہ "الرائے" کے لفظ سے جو طریقہ بدنام کیا گیا ہے اس میں کتنی زبردستیوں سے کام لیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)